ڈاکٹر محمد عبدالجلیل فریدی

(۲۷ر دسمبر ۱۹۱۳ء - ۱۹ر مئی ۱۹۷۴ء)

ڈاکٹر محمد عبدالجلیل فریدی صاحب کے انتقال سے ایک بڑی قیمتی شخصیت ہمارے درمیان سے اُٹھ گئی (خدا مغفرت کرے اور جنت الفردوس میں جگہ دے) حاذق اور نامور معالج، نہایت اچھے مسلمان، اعلیٰ انسان، بااخلاق، بامروّت، سیر چشم، باغ و بہار اور صاحب عزم و کردار۔

ایک معالج کی حیثیت سے جتنا نام کمایا، اتنی ہی نیک نامی اور انسان دوستی کی شہرت بھی اس میدان میں حاصل کی۔ شفا دینے والا اللہ ہے مگر جس پر ہاتھ رکھ دیا، عام طور سے شفا ہی پا گیا، مسیح الملک انھیں کہا جاتا تو بجا تھا۔ اس حذاقت اور دستِ شفا کے باوجود کماتے اتنا نہیں تھے جتنی للہ خدمت کرتے تھے۔ ایک محدود وقت میں فیس والے مریضوں کو دیکھتے اور اس سے زیادہ وقت بے فیس مریضوں کو دیتے۔ اُن کے پائے کا کوئی دوسرا ڈاکٹر لکھنؤ میں اس طور طریق کا نہیں تھا اور نہ ہے۔ یہ چیز خود بھی محبوبیت عطا کرنے والی تھی مگر اس پر مزید اُن کی خوش روئی و زیبائی، پھر ہنستا ہوا چہرہ، باغ و بہار طبیعت اور دلنواز، انداز اس محبوبیت کو چار چاند لگا دینے والے تھے۔

طبّی خدمت کے علاوہ داد و دہش کا بھی ان کی زندگی میں ایک اہم باب تھا۔ اور جس طرح طبّی خدمت روزانہ کا معمول تھی، بالکل اسی طرح حاجت مندوں کی مالی خدمت کو بھی معمول بنا رکھا تھا۔ مطب کے لیے نکلتے تو ایک خاص رقم اس مد میں ساتھ لے کر نکلتے اور دروازے ہی سے شروع کر کے واپسی تک ختم کر دیتے۔

دینی رُخ سے پورے پابندِ فرائض، مغرب کا وقت مطب میں آتا تھا، وہاں باقاعدہ جماعت سے ادا کرتے۔ حج کے فریضے سے ہی سبک دوش نہیں ہوئے تھے بلکہ عمرہ کے لیے بھی سرزمین پاک پر حاضری کی سعادت پائی۔ لباس میں ہمیشہ مشرقی مسلمان نظر آئے، مغربی لباس میں دیکھا تو زیادہ

سے زیادہ بس اتنا کہ سردی کے موسم میں گرم پتلون، شیروانی اس پر بھی برقرار رہتی۔

لکھنوی اخلاق وانکسار کے ساتھ غیور وخوددار بھی اتنے ہی تھے۔داب میں کسی کی، کبھی نہیں آئے اور میدان میں بہت ہی اعلیٰ ودلکش نقوش قائم کیے۔دل کے جتنے نازک مریض تھے اُتنے ہی اس کے برعکس مضبوط بھی۔ارادہ بھی جو باندھ لیتے، اُسے پورا کرنے میں عمل کا کوئی دقیقہ نہ رکھتے تھے۔ان اوصاف کے جوہر ان کی سیاسی زندگی میں کھلے۔بلکہ سرگرم سیاست میں اُن کو لانے والی چیز ہی، (خود ان کے بیان کے مطابق) ان اوصاف میں سے اُن کی پہلی صفت، غیرت اور خودداری تھی۔غالباً ۱۹۵۲ء کی بات بتاتے تھے کہ یوپی کانگریس وزارت کے وزیر اور 'مردآہن' شری سی-بی- گپتا نے اُنھیں ایک غلط اطلاع پر کسی سے ٹیلیفون کرایا کہ اُن کے حریف امیدوار شری ترلوکی سنگھ کا ساتھ نہ دیں۔یہ انداز ڈاکٹر صاحب کی غیور طبیعت کو چرکہ لگا گیا۔ٹیلیفون کرنے والے شناسا سا آدمی کے یہ کہنے پر کہ ''میں گپتا جی کے یہاں سے بول رہا ہوں'' خود کہتے تھے کہ بس میں نے اتنا کہہ کر کہ ''اچھا! میں تو یہ سمجھا کہ تم اللہ میاں کے یہاں سے بول رہے ہو۔'' ٹیلیفون بند کردیا اور بغیر کسی پہلے سے دلچسپی کے شری ترلوکی سنگھ کے لیے کنویسنگ کو نکل پڑے! یہ اُن کی سیاست کا نقطۂ آغاز ہے اور اسی آغاز والے انداز کو نبھاتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوگئے۔

۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۲ء تک شری ترلوکی سنگھ وغیرہ کی بنائی ہوئی پارٹی (پرجا سوشلسٹ پارٹی) میں رہے۔یہ پارٹی تحلیل ہونے لگی تو بے پارٹی ہوگئے اور پھر ۱۹۶۴ء میں مجلس مشاورت بننے لگی تو اس میں پوری دلچسپی لے کر شروع ہی سے شامل ہوئے۔یہیں سے اُن کی سیاسی زندگی کا وہ دور شروع ہوتا ہے، جس میں اُن کے عزم وارادے کی پختگی اور بیماری کے باوجود دل کی مضبوطی کے جوہر پورے ملک پر کھلے اور ذہنی حیثیت سے اُن کی بعض سیاسی صلاحیتیں نمایاں ہوئیں۔یہاں سے وہ آناً فاناً ایک مسلم لیڈر کی سطح پر آگئے۔۱۹۶۷ء کے الیکشن کے بعد سے مرکزی کانگریس اور مرکزی حکومت تک کے لیے ممکن نہ رہا کہ انھیں نظر انداز کرے۔بلکہ صحیح الفاظ میں، مسلمانوں کے اندر اُن کی طاقت کا ہوّا، کانگریس اور غیر کانگریس سبھی پر بیٹھ گیا۔ایک جن سنگھ کو چھوڑ کر سبھی طرف سے اُن کو ساتھ لینے کی کوشش ہوئی۔اور وہ جدھر مناسب دیکھتے اُدھر جھک جانے کے بعد تن من

دھن سے اپنا رول ادا کرنے پر لگ جاتے۔ اُن کا آخری سیاسی معرکہ ۱۹۷۴ء کا یو پی الیکشن تھا۔ اس میں انھوں نے کانگریس کے خلاف ایک اتحادی محاذ میں شریک ہوکر اپنی بیمار توانائی کے آخری قطرے بھی نچوڑ دیے۔

دل کے ساتھ پھیپھڑوں کے بھی مریض تھے، یعنی جس مرض کے مسیحا تھے اُسی میں خود گرفتار۔ ۱۹۷۲ء میں تکلیفیں بڑھ جانے پر طبّی معائنہ اور علاج کے لیے ماسکو اور لندن گئے اور اس مایوس کن تشخیص کے ساتھ واپس آئے کہ ان کی زندگی ڈیڑھ، دو سال سے زیادہ نہیں ہے، بے اختیار اُن کے جیالے پن کی بلائیں لینے کو جی چاہتا ہے کہ اس ڈاکٹری اندازے کو سُن کر اور مان کر اُنھوں نے بستر کا رُخ نہیں کیا، بلکہ جو کام انھوں نے چھیڑ رکھا تھا اُسے پورا کرنے کے لیے میدان عمل کی طرف لپکے اور اسی میں جیل خانہ آباد کرنے کی بھی نوبت آئی، وہ بھی مئی رجون ۱۹۷۳ء کی گرمی میں، پھر اس سال یو پی کے الیکشن کا میدان گرم ہوا، تو مرض کی ایسی شدت کے عالم میں کہ دوسرا کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھنے کی ہمت نہ کرتا، انھوں نے ایک ہمتِ مردانہ کے ساتھ اپنے آپ کو اس میں جھونک دیا۔ اور بس پھر اس معرکے سے جو نکلے تو زندگی کے چراغ کو کچھ سانس اور لینے کی ہی مہلت تھی۔ الیکشن کے دوروں میں وقت ناوقت سفر کی جو مشقت اُٹھانا پڑتی ہے، جو گرد اور دھول دیہاتوں کی پھانکنا پڑتی ہے، جو مسلسل تقریروں اور گفتگوئیں کرنا پڑتی ہیں، دل اور پھیپھڑے کے نازک مریضوں کے لیے زہر قاتل۔ یہ زہر اپنا کام کر گیا اور ڈاکٹر صاحب کو بظاہر اس طرح لیٹ جانا پڑا کہ اب اُٹھ نہ سکیں گے، مگر آفریں کہ انھوں نے پھر ایک سنبھالا لے کر مطب آنا شروع کر دیا۔ لیکن یہ بجھتے چراغ کی بس آخری سانسیں ہی تھیں۔ ۱۶ریا ۱۷رمئی کو آندھی آئی، جس سے مطب آتے یا جاتے میں ڈاکٹر صاحب کو سامنا پڑ گیا اور اس کی غبار کے اثرات نے ۱۹رمئی ۱۹۷۴ء سے آگے اِن اُکھڑی اُکھڑی سانسوں کو بھی جاری رہنے کی مہلت نہ دی۔ رہے نام اللہ کا! ہم سب اللہ ہی کی مخلوق، اسی کے زیرِ حکم اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے کو ہیں (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔

ڈاکٹر صاحب نے جو عزت و عظمت پائی، اس کے وہ مستحق تھے۔ مگر افسوس کہ جو جگہ انھوں نے اپنے استحقاق سے حاصل کر لی تھی، اُس پر آخر تک برقرار نہ رہ سکے۔ سیاست اُتار چڑھاؤ کی

وادی ہے، اس لیے یہاں ایسے واقعات میں پھر بھی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ اہم اور یاد رکھنے کی بات ڈاکٹر صاحب کے سلسلے میں یہ ہے کہ انھوں نے آن اور کردار کے معاملے میں بھی ایک قابل تقلید مثال اگلوں کے اُٹھ جانے کے بعد مسلم لیڈروں کے لیے قائم کی اور تن داغ داغ ہو جانے کے باوجود آخر تک سرگرم عمل رہنے کا تو وہ نقش قائم کیا، جن میں اپنی مثال وہ دور دور تک آپ ہی ہیں۔ علمی اور ذہنی طور پر بھی وہ موجودہ مسلم لیڈروں میں منفرد نظر آتے تھے۔ سیاسیات میں باقاعدہ اور تازہ بتازہ مطالعہ کا ذوق رکھتے اور اس سے اخذ واستفادہ کی ایسی صلاحیت کہ تحریر وتقریر میں اپنے موقف پر ان کا استدلال عموماً موثر اور باوزن ہوتا تھا۔ ہمارے نزدیک مسلسل جدوجہد کے علاوہ یہی ان کی وہ خصوصیت تھی، جس کے سبب سے مسلمانوں کے معاملے میں اُن کی وکالت ملک کے سیاسی ذہن پر اثر انداز ہونے میں جتنی کامیاب ہوئی، کسی دوسرے لیڈر کو یہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔

ہمیں ڈاکٹر صاحب کی سیاست کے بعض پہلوؤں سے اتفاق نہ تھا۔ لیکن ہم انھیں مذکورہ اوصاف کی بنا پر اپنی (یعنی ملّت کی) ایک جنس گراں مایہ سمجھتے تھے۔ اور اسی لیے اختلاف کے اظہار میں وہ تلخ نوائی بھی کبھی کبھی پیدا ہو جاتی تھی، جو اپنی ایسی قیمتی شئ کو ضائع ہوتے سمجھنے کے درد سے پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمیں اُن کا راستہ بارآور ہوتا نظر نہیں آتا تھا، جب کہ اُن کی قائدانہ صلاحیتوں کے اعتبار سے امید ہوتی تھی کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک بارآور راستے پر ڈال سکتے ہیں، یہی درد تھا جس کے آخری بار (گزشتہ سال) اظہار نے مرحوم کے اظہار ناراضگی کی وہ صورت رونما کردی جس پر ہمیں ہمیشہ ملال رہے گا کہ کاش یہ آخری اظہار درد ہم سے نہ ہوا ہوتا۔ وہ تلخ نوائی برداشت کرنے کے حال میں نہ تھے اور ہم اپنے درد سے اس صورت حال کو ملحوظ رکھنے کے حال میں نہیں۔ خدا بال بال مغفرت کرے، اُن کے بلند اوصاف ہمیشہ یاد رکھنے اور سبق لیتے رہنے کے قابل ہیں۔

(ماہنامہ الفرقان، جولائی، اگست ۱۹۷۴ء)

□□□